Research Journal
Tahqeeqat
جلد:5، شمارہ:1، 2026ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

یوسف حسین خان کی کتاب "روحِ اقبال" کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

The Depiction of Urban Life in the Urdu Novelette

Zahoor Ahmad
MS Scholar, The Superior University, Lahore
haroonzahoor125@gmail.com
Dr. Mubashar Saeed Bajwa
Assistant Professor Department of Urdu,
The Superior University, Lahore
mubasharsaeed550@gmail.com

ظہور احمد
ایم۔ ایس اسکالر، دی سپیریئر یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر مبشر سعید باجوہ
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، دی سپیریئر یونیورسٹی، لاہور

Abstract

This research article presents a comprehensive critical and analytical study of Dr. Yusuf Hussain Khan's seminal work, Rooh-e-Iqbal (The Spirit of Iqbal). Since its first publication in 1944, this book has been regarded as a cornerstone of Iqbalian scholarship, providing a systematic and organic framework to understand the complex intellectual landscape of Allama Iqbal. The study examines Khan's unique tripartite division of Iqbal's thought into Art (Aesthetics), Civilization (Socio-Political thought), and Religion (Metaphysics). The article delves into how Yusuf Hussain Khan explores the "creative fire" (Soz-e-Daroon) and aesthetic mastery of Iqbal, while simultaneously connecting his concept of Khudi (Selfhood) to the نامیاتی *(organic) relationship between the individual and the Muslim community (Millat). A significant portion of the study is dedicated to Khan's interpretation of Iqbal's philosophy of history, specifically the Quranic principles governing the rise and fall of nations and the reconstruction of Islamic political and economic systems. Furthermore, the study analyzes the metaphysical discourses on Time, Destiny, and the spiritual significance of the Miraj (Ascension). While acknowledging modern critical perspectives that view the book as primarily descriptive, this research concludes that Rooh-e-Iqbal remains an indispensable primary source that elevated Iqbalian studies to a global academic standard, bridging the gap between classical Islamic tradition and modern Western philosophy.*

Keywords: *Iqbal Studies, Dr. Yusuf Hussain Khan, Rooh-e-Iqbal, Selfhood, Urdu Literary Criticism, Islamic Civilization, Metaphysics and Religion, Philosophy of Art, Rise and Fall of Nations, Modern Urdu Prose.*

کلیدی الفاظ: اقبالیات، ڈاکٹر یوسف حسین خان، روحِ اقبال، خودی، اردو ادبی تنقید، اسلامی تہذیب، مابعد الطبیعیات اور مذہب، فلسفۂ فن، عروج و زوالِ اقوام، جدید اردو نثر

بیسویں صدی کے فکری و ادبی منظر نامے پر حکیم الامت علامہ اقبال کی شخصیت ایک ایسی ہمہ گیر حقیقت بن کر ابھری جس نے نہ صرف اردو اور فارسی ادب کو نئی لسانی رفعتیں عطا کیں بلکہ اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کے ذریعے ایک تہی دست قوم میں حرکی توانائی بھی پیدا کی۔ اقبال شناسی کے اس وسیع اور متنوع سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف "روحِ اقبال" کو ایک ایسی اساسی اور کلیدی دستاویز کا درجہ حاصل ہے جس نے حکیم الامت کے بکھرے ہوئے منظوم و منثور افکار کو ایک مربوط اور نامیاتی علمی نظام کے طور پر متعارف کرایا۔ 1944ء میں اپنی پہلی اشاعت

OPEN ACCESS
HEC
DRJI
ISSN INTERNATIONAL STANDARD SERIAL NUMBER INTERNATIONAL CENTRE
اشاریہ اردو جرائد
EuroPub

سے لے کر عصرِ حاضر تک، یہ کتاب اپنی فکری گیرائی، اسلوب کی پختگی اور وضاحتی جامعیت کے باعث اقبالیات کے اہم ترین مآخذ میں شمار کی جاتی ہے، جس نے اقبال کے فلسفے کو ایک ایسے منطقی قالب میں ڈھال دیا ہے جو محققین اور عام قارئین دونوں کے لیے فکری تشفی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کا تحقیقی و تنقیدی منصب اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے اقبال کو محض ایک مصلحِ قوم یا شاعرِ مشرق کے روایتی خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے، ان کے فکر و فن کو ایک ایسی مثلث کی صورت میں پرکھا جس کے تین بنیادی زاویے فن (آرٹ)، تمدن اور مذہب ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں "روحِ اقبال" کی اسی سہ گانہ تقسیم اور اس کے تحقیقی مضمرات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے، جہاں مصنف نے ایک طرف تو اقبال کی شعری جمالیات، صوتی آہنگ اور فنی صناعی کی طلسم کشائی کی ہے اور دوسری طرف ان کے سیاسی، معاشی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات کو قرآنی بصیرت اور عالمی فلسفے کے تقابلی تناظر میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف "روحِ اقبال" بیسویں صدی کی اقبال شناسی میں ایک ایسی کلیدی اور بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس نے حکیم الامت کے افکار کو ایک مربوط علمی نظام کے طور پر متعارف کرایا۔ 1944ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آنے والی یہ کتاب اپنی سہل پسندی اور فکری گہرائی کے باعث اس قدر مقبول ہوئی کہ محض چند دہائیوں میں اس کے سات ایڈیشن شائع ہوئے اور یہ برصغیر کی اہم جامعات کے نصاب کا مستقل حصہ بن گئی۔ یوسف حسین خان نے اس کتاب کی تالیف کے ذریعے یہ کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت، ان کے فلسفۂ حیات اور فنی کمالات کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جائے جو محققین اور طلبہ دونوں کے لیے یکساں طور پر مشعلِ راہ بن سکے۔

اس کتاب کی فکری ساخت محض سوانحی یا روایتی تشریحات پر مبنی نہیں، بلکہ مصنف نے نہایت باریک بینی سے اقبال کے بکھرے ہوئے منظوم و منثور افکار کو تین بڑے فکری زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ یوسف حسین خان کے نزدیک اقبال کے مطالعے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ ان کے خیالات کو فن، تمدن اور مذہب کے عنوانات کے تحت دیکھا جائے، کیونکہ یہی وہ تین بنیادیں ہیں جن پر انسانی زندگی اور کائنات کا پورا نظام استوار ہے۔ مصنف کا تحقیقی اسلوب یہ واضح کرتا ہے کہ وہ اقبال کو محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک ایسے مفکر کے طور پر دیکھتے ہیں جس کے پاس حیات و کائنات کے ہر مسئلے کا ایک واضح حل موجود ہے۔

کتاب کا پہلا جزو "اقبال اور فن" کے عنوان سے ہے، جس میں مصنف نے اقبال کے تصورِ آرٹ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں یوسف حسین خان یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک شاعری مقصود بالذات نہیں بلکہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ اس حصے میں فن اور زندگی کے باہمی رشتے، خلوصِ شعری، رومانوی پیکر تراشی اور غزل گوئی جیسے فنی پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف نے یہ نکتہ اجاگر کیا ہے کہ اقبال کا آرٹ ان کے فلسفۂ خودی کا تابع ہے اور وہی فن مستحسن ہے جو خودی کی پرورش میں مددگار ثابت ہو۔ اس فکری تقسیم کی ضرورت پر ڈاکٹر یوسف حسین خان خود کتاب کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> "میں نے اقبال کے خیالات کو اپنے مطالعے کی سہولت کے مدنظر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:
> آرٹ، تمدن اور مذہب۔ ان تین شقوں کے تحت زندگی اور کائنات کے تمام اہم مسائل آجاتے ہیں،
> جن کی نسبت اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔"(1)

کتاب کا دوسرا اور سب سے ضخیم حصہ "اقبال کا فلسفۂ تمدن" ہے، جو تقریباً دو سو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں یوسف حسین خان نے اقبال کے عمرانی اور سیاسی تصورات کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کیا ہے جس میں خودی، اجتماعی خودی، عروج و زوال کے اسباب، نظامِ معیشت اور

اسلامی جمہوریت جیسے معرکۃ الآراء مسائل شامل ہیں۔ مصنف نے یہاں یہ دکھایا ہے کہ اقبال کس طرح مغربی تہذیب کی مادیت پرستی سے بیزار ہو کر ایک ایسے صالح تمدن کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس کی اساس قرآنی تعلیمات پر ہو۔ یہ حصہ مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کی بحالی کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

تیسرا باب ''اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات'' کے لیے وقف ہے، جسے کتاب کا سب سے مغلق اور فلسفیانہ حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں یوسف حسین خان نے حیرت خانۂ عالم، وجودِ باری تعالیٰ، توحید، تقدیر، مسئلۂ جبر و اختیار اور معراجِ نبوی ﷺ جیسے پیچیدہ موضوعات کی تشریح کی ہے۔ مصنف نے اقبال کے خطبات اور ان کی فارسی مثنویوں کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ اقبال کا مذہب محض رسمی عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ کائنات کی حرکی حقیقت کو سمجھنے اور خالقِ کائنات سے ہم کلام ہونے کا ایک وجدانی ذریعہ ہے۔

تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یوسف حسین خان کی یہ سہ گانہ تقسیم اقبال شناسی کی تنقید میں ایک وضاحتی اور تشریحی سنگِ میل ہے۔ اگرچہ بعض نقاد، جیسے پروفیسر حامدی کاشمیری، اس تقسیم کو تخلیقی تنقید کے بجائے موضوعاتی توضیح سے تعبیر کرتے ہیں، مگر وہ بھی اس کتاب کی تاریخی اور علمی اہمیت کے منکر نہیں ہیں۔ حامدی کاشمیری کے مطابق یہ کتاب اقبال کی شعری حیثیت کی شناخت کے بجائے ان کے افکار کی صراحت پر زیادہ زور دیتی ہے، جس کی اپنی ایک درسی و علمی افادیت ہے۔ اس کتاب کے عمومی مزاج پر پروفیسر حامدی کاشمیری یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''کتاب کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس میں نقد و نظر کا کم و بیش وہی عمومی، وضاحتی اور اکتسابی طریقۂ عمل لایا گیا ہے جو عمومی طور پر اقبالیاتی تنقید کے موجودہ بیشتر حصے میں ملتا ہے، یعنی اس میں اقبال کی شاعری میں در آنے والے ان کے فکر و فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کی توضیح و تفسیر کی کوشش کی گئی ہے۔''(2)

اس فکری ساخت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ مصنف نے اقبال کے کلام کی اثر آفرینی کے اسباب کو بھی اسی ڈھانچے میں سمو دیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی تاثیر کے تین بنیادی اسباب ہیں: ان کی بلند شخصیت کا کرشمہ، خلوص اور طرزِ ادا کی ندرت۔ یوسف حسین خان نے ان تینوں اسباب کو فن، تمدن اور مذہب کے خانوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ قاری کو اقبال کے فکر و فن میں ایک نامیاتی وحدت نظر آتی ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال کا کلام محض معین افکار کا منظوم اظہار نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔

علامہ اقبال کی شعری کائنات میں جمالیات محض ظاہری حسن کی ستائش کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی تخلیقی قوت ہے جو فنکار کے باطنی سوز اور ''خونِ جگر'' سے نمو پاتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ''روحِ اقبال'' میں اس نکتے کو نہایت علمی بصیرت کے ساتھ واضح کیا ہے کہ اقبال کا تصورِ فن ان کے تصورِ کائنات اور فلسفۂ خودی کے تابع ہے۔ ان کے نزدیک آرٹ محض ایک تفریحی مشغلہ یا محض قافیہ پیمائی نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی کی خدمت کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ اقبال کے ہاں جمالیات کا تصور سکونی نہیں بلکہ حرکی ہے، جہاں حسن وہ ہے جو انسان کے اندر جرات، قوت اور عمل کی تڑپ پیدا کر دے۔

یوسف حسین خان نے کلامِ اقبال میں موجود ''سوزِ دروں'' کو اس کی مقبولیت اور تاثیر کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق، اقبال کا خلوص ان کے لفظوں میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے، جس سے ہر لفظ ایک دلِ بیتاب کی طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اگر فنکار کے اندر وہ باطنی تپش موجود نہ ہو جسے اقبال ''خونِ جگر'' کہتے ہیں، تو اس کا فن بے جان مٹی کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اقبال کی شاعری اس لیے ساحری اور پیغمبری کے درجے تک پہنچتی ہے کیونکہ اس کے پیچھے ایک مخلص اور آتش فروش جذبہ کارفرما ہے جو سامع کی روح

میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اس فنی اثر آفرینی کے حوالے سے پروفیسر محسن عثمانی ندوی لکھتے ہیں:

> ''بحیثیت فنکار اقبال نے اپنے تصورات اور خیالات کو اتنے فنکارانہ انداز میں اور لفظوں کے موزوں قالب میں پیش کیا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کی روح کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں۔ اس عظیم اثر آفرینی کی وجہ وہ بے پایاں خلوص اور سوز ہے جو فنکار کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ نہ نواز کا دل ہے نہ کہ چوبِ نَے جس کا نغمہ آتشیں دل کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔''(3)

اقبال کے شعری مآخذ کے مطالعے میں یوسف حسین خان نے فارسی کی کلاسیکی روایت اور بالخصوص مولانا روم کے فیضان کو کلیدی اہمیت دی ہے۔ مصنف کے مطابق، اقبال نے اگرچہ غزل اور مثنوی جیسی قدیم اصناف کو برتا، لیکن ان میں موجود علائم و رموز کو ایک بالکل نئی معنویت عطا کی۔ انہوں نے داغ دہلوی سے زبان کی صفائی اور ابلاغ کا ہنر سیکھا، مگر ان کا فکری سرچشمہ حجازی تمدن اور رومی کا حرکی تصوف رہا۔ یوسف حسین خان نے دکھایا ہے کہ اقبال نے رومی کے اس تصور کو اپنایا جہاں عشق عقل کا مدمقابل بن کر حقیقت کی براہِ راست رسائی کا ذریعہ بنتا ہے۔

فنی پختگی اور صنعت گری کے باب میں یوسف حسین خان نے اقبال کی منظر کشی اور مصوری کو کمالِ فن سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے ''بزمِ انجم''، ''کشمیر'' اور ''ایک آرزو'' جیسی نظموں کے تجزیے سے یہ ثابت کیا کہ اقبال الفاظ کے طلسم سے فطرت کی ایسی تصویریں کھینچتے ہیں کہ قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی نفاست محض تزیینِ کلام کے لیے نہیں، بلکہ وہ پیچیدہ افکار کو بصری تمثالوں میں بدلنے کا ایک فنکارانہ طریقہ ہے۔ مصنف کے نزدیک اقبال ''تشبیہوں کے بادشاہ'' ہیں جو مرقع نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اقبال کی جمالیات میں جلال اور جمال کا حسین امتزاج ایک منفرد پہلو ہے، جسے یوسف حسین خان نے ''دلبری'' اور ''قاہری'' کے اصطلاحی تلازموں سے واضح کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال کے نزدیک وہی فن مکمل ہے جس میں حسن کی دلکشی کے ساتھ ساتھ حق کی ہیبت اور قوت بھی موجود ہو۔ اگر فن میں صرف جمال ہو اور جلال نہ ہو تو وہ انسان کو بے عملی اور افسردگی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال کا آرٹ پیغمبری کے منصب سے قریب تر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ قوموں کی تقدیر بدلنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ اس امتزاجی کیفیت پر ایم ڈی موصوف احمد رقم طراز ہیں:

> ''اقبال کے فن کے تصور میں جمالی اور جلالی دونوں عنصر شامل ہیں اور دونوں ضروری ہیں اور دونوں کے امتزاج سے فن پیغمبری سے قریب ہونے لگتا ہے۔
>
> دلبری بے قاہری جادوگری است
> دلبری با قاہری پیغمبری است
>
> وہ آرٹ کو زندگی کا خادم خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنی شخصیت کی قوت اور جوشِ عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کر لے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو جائے۔''(4)

کلامِ اقبال میں صوتی محاکمات اور نغمگی کے عناصر کا سراغ لگاتے ہوئے یوسف حسین خان نے نظم ''ایک شام'' کی مثال دی ہے، جہاں حروف کی تکرار (بالخصوص حرفِ شین) سے خاموشی کا ایک سحر انگیز منظر تخلیق کیا گیا ہے۔ مصنف کا تحقیقی استدلال یہ ہے کہ اقبال زبان کے صوتی آہنگ

سے پوری طرح واقف تھے اور وہ جانتے تھے کہ کس طرح مخصوص حروف کے ذریعے سامع کے تخیل پر مطلوبہ اثرات مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ فنی مہارت اقبال کو ایک ایسے معمار کا درجہ دیتی ہے جو لفظوں کی ترتیب سے معانی کے محل تعمیر کرتا ہے۔

اقبال کے فنی تجزیے کا ایک اور اہم گوشہ غزل گوئی ہے، جس کے متعلق یوسف حسین خان کا خیال ہے کہ اقبال نے روایتی غزل کو مقصد پسندی اور اجتماعی قوت سے آشنا کیا۔ انہوں نے غزل کی رعنائی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں فکر کی وہ مسلسل لہر شامل کی جو عام طور پر نظم کا شیوہ سمجھی جاتی تھی۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ اقبال کی غزلوں میں موجود رمزیت اور کنایہ نگاری دنیا کے کسی بھی دوسرے ادب کے مقابلے میں زیادہ گہری اور معنی خیز ہے، کیونکہ وہ محض انفرادی وارداتِ قلبی تک محدود نہیں بلکہ پوری ملت کے دکھوں اور تمناؤں کی ترجمان بن گئی ہے۔ یوسف حسین خان نے "روحِ اقبال" کے ذریعے کلامِ اقبال کی ان فنی نفاستوں کو دریافت کیا جو پیغام کی چکا چوند میں اکثر نظر انداز کر دی جاتی تھیں۔ یوسف حسین خان نے کلامِ اقبال کے فنی محاسن کو پرکھنے کے لیے جو جمالیاتی معیار قائم کیا، اس نے اردو کی جدید تنقید کو ایک نیا رخ عطا کیا جس میں فکر اور فن کو ایک نامیاتی وحدت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات میں "خودی" وہ مرکزی اور کلیدی لفظ ہے جس کے گرد ان کی پوری شعری اور فکری کائنات گردش کرتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی تصنیف "روحِ اقبال" میں اس تصور کی تفہیم اس انداز میں کی ہے کہ یہ محض ایک تجریدی اصطلاح رہنے کے بجائے ایک جیتی جاگتی حرکی قوت بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کے ہاں زندگی کا اصل محرک اثباتِ خودی کا وہ جذبہ ہے جو انسان میں فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ خودی دراصل خودداری، خودشناسی اور خودکشائی کے مختلف مراحل سے گزر کر اپنے جوہر کو مستحکم کرتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر فرد کی شخصیت کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

خودی کی ماہیت کو واضح کرتے ہوئے یوسف حسین خان یہ نکتہ ابھارتیں ہیں کہ یہ کائناتِ رنگ و بو کا مادی حصہ نہیں بلکہ اس کا حقیقی پتہ صرف وجدان ہی سے چلتا ہے۔ حواسِ ظاہری اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ خودی ایک ایسا راز ہے جو مستقل فعلیت اور پیہم عمل سے عبارت ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کا استحکام ہی زندگی کا واحد معیار ہے، اور جو چیز اس قوت کو تقویت بخشے وہ خیر ہے اور جو اسے کمزور کرے وہ شر ہے۔ مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ خودی محض ایک سکونی کیفیت نہیں بلکہ ایک لامتناہی سمندر ہے جس کی وسعتوں کا انحصار انسان کی ہمت اور عزم پر ہوتا ہے۔

فرد کی انفرادی حیثیت اور اس کے سماجی تلازمات کے درمیان یوسف حسین خان نے ایک نہایت لطیف استعاراتی رشتہ قائم کیا ہے۔ انہوں نے فرد کو ایک "گوہر" (موتی) سے تشبیہ دی ہے جو اپنی انفرادی حقیقت تو رکھتا ہے مگر اس کی پرورش کے لیے صدف (سیپ) کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہاں صدف سے مراد وہ ماحول اور معاشرہ ہے جس میں فرد آنکھ کھولتا ہے، جبکہ سمندر اس وسیع تر حیاتِ اجتماعی یا ملت کا عکاس ہے جس سے صدف اور گوہر دونوں مربوط ہوتے ہیں۔ اس نامیاتی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے محسن عثمانی ندوی رقم طراز ہیں:

> "انسانی زندگی ایک گوہر کے مانند ہے یہ حیاتِ انفرادی ہے لیکن یہ گوہر صدف میں پرورش پاتا ہے۔ صدف استعارہ ہے گردوپیش کے ماحول کا۔ پھر اس صدف کا تعلق سمندر کی پہنائیوں سے ہے۔ یہ وسیع تر حیاتِ اجتماعی کا عکاس ہے۔ گویا گوہر زندگی کی پرورش ماحول اور معاشرہ میں ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی اپنی تمام تر انفرادیت کے باوصف حیاتِ اجتماعی سے دامن کش نہیں۔"(5)

فرد اور ملت کا یہ تعلق اقبال کے نزدیک کوئی خارجی جبر نہیں بلکہ ایک روحانی ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی ارتقاء ناممکن ہے۔ یوسف حسین

خان کے مطابق، فرد کی شخصیت تمدنی ماحول کے بغیر اپنی آب و تاب حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ تمدن ہی وہ مدرسہ ہے جہاں انسان کو ذمہ داری اور فرض کا احساس ہوتا ہے۔ اس رشتے میں خودی دوسروں کے حقوق کے احترام کے ساتھ ساتھ اپنے جوہر کو نکھارنے کا سلیقہ سیکھتی ہے۔ مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ اقبال کے ہاں انفرادیت پسندی کا مطلب گروہ سے کٹ جانا نہیں، بلکہ ملت کے وسیع تر مقاصد میں اپنی خودی کو اس طرح وقف کر دینا ہے کہ فرد اور جماعت ایک اکائی بن جائیں۔

ملت کی تشکیل میں یوسف حسین خان نے "اجتماعی خودی" کے تصور کو خاص اہمیت دی ہے جو افراد کے باہمی ربط سے جنم لیتی ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق، جس طرح فرد کا ایک حافظہ ہوتا ہے جو اس کے ماضی کو حال سے جوڑتا ہے، اسی طرح ملت کی بقا بھی اس کی تاریخی روایات اور اسلاف کے کارناموں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد کی حیثیت ایک موج کی سی ہے جو سمندر کے اندر تلاطم تو پیدا کر سکتی ہے مگر سمندر سے باہر نکل کر اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نامیاتی وحدت ہے جہاں فرد اور جماعت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن جاتے ہیں اور قوم ایک حقیقی وجود کے طور پر ابھرتی ہے۔

خودی کی حدود اور اس کی عبدیت کے حوالے سے یوسف حسین خان نے اقبال کے اسلامی نقطۂ نظر کی نہایت بلیغ ترجمانی کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ خودی اپنے شعور کے اعلیٰ ترین نقطے پر پہنچ کر بھی خدا کے ارادے کے تابع رہتی ہے اور یہی اس کی اصل معراج ہے۔ یہ ایک مخلوق ہے جس میں باری تعالیٰ نے بے انتہا امکانات پوشیدہ رکھے ہیں، مگر اس کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو مٹانے کے بجائے اسے الٰہی صفات کے سانچے میں ڈھال لے۔ مصنف نے اس نکتے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ خودی کی منزل فنا ہونا نہیں بلکہ بقا ہے، جو کہ خالقِ کائنات کے ارادے سے ہم آہنگ ہونے میں پوشیدہ ہے۔ اس فکری جہت پر ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

> "خودی کا اسلامی تصور یہ ہے کہ فرد مخلوق ہے، جس کی ذات میں ذاتِ باری نے بے انتہا امکانات پوشیدہ رکھے ہیں۔ سب کے سب زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے۔ خودی اپنے شعور کے اعلیٰ ترین نقطے پر پہنچ کر بھی عبدیت کے عقیدے کے مطابق تابع اور محدود رہتی ہے اس واسطے کہ اس کا تعلق فانی بدن سے ہے۔"(6)

فرد اور ملت کے اس رشتے میں عمل اور اخلاق کو سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ یوسف حسین خان کے نزدیک اقبال کی خودی کا عملی اظہار ہی "عملِ صالح" سے ہوتا ہے جو کہ محض گوشہ نشینی کا نام نہیں ہے۔ عمل سے مراد طبعی قوتوں کو مسخر کرنا اور کائنات کے پوشیدہ اسرار تک رسائی حاصل کرنا ہے تاکہ ملت کو استحکام نصیب ہو۔ جب فرد اپنی انفرادی صلاحیتوں کو ملت کے عروج کے لیے وقف کرتا ہے، تو وہ دراصل اپنی خودی کی تربیت کر رہا ہوتا ہے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ اقبال کے ہاں خودی اور ملت کا توازن ہی وہ واحد راستہ ہے جو مسلمانوں کو انفرادی انتشار سے بچا کر ایک مربوط قومی وجود عطا کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنی تصنیف "روحِ اقبال" میں علامہ اقبال کے فلسفۂ تاریخ کو محض ایک علمی بحث کے طور پر نہیں، بلکہ اسے مسلمانوں کے سیاسی و تمدنی عروج و زوال کے ایک ناگزیر ضابطے کے طور پر پیش کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اقبال کا تصورِ تاریخ کلی طور پر قرآنی بصیرت سے ماخوذ ہے، جہاں کائنات کے ہر گوشے کی طرح قوموں کی زندگی اور موت کے بھی اٹل الٰہی قوانین موجود ہیں۔ یوسف حسین خان نے یہ نکتہ اجاگر کیا ہے کہ تاریخ محض واقعات کا تسلسل نہیں، بلکہ یہ انسانی اعمال کے نتائج کا ایک آئینہ ہے جو ہر دور میں اپنی صداقت کو دہراتا رہتا ہے۔

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یوسف حسین خان یہ واضح کرتے ہیں کہ کائنات میں انسان کی حیثیت اللہ کے نائب کی ہے اور اسے "خلافتِ ارضی"

کا منصب سونپا گیا ہے۔ تاہم یہ منصب کسی خاص گروہ یا نسل کی جاگیر نہیں، بلکہ یہ ان قوموں کو ملتا ہے جو اپنی فکری اور عملی قوت سے خود کو اس کا مستحق ثابت کرتی ہیں۔ مصنف کے مطابق، قرآنِ پاک میں گذشتہ قوموں کے احوال و وقائع اسی لیے بیان کیے گئے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں ان سے عبرت حاصل کریں اور یہ جان لیں کہ کائنات کی سیادت کا راز مسلسل جدوجہد اور حقائقِ اشیاء کے علم میں پوشیدہ ہے۔

عروجِ ملت کے باب میں یوسف حسین خان نے "عملِ صالح" کی ایک نئی اور انقلابی تشریح پیش کی ہے، جو روایتی خانقاہی تصورات سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کے ہاں عملِ صالح سے مراد تسبیح و مناجات کی کثرت نہیں، بلکہ طبعی قوتوں کو مسخر کرنا اور سائنسی علوم کے ذریعے کائنات پر غلبہ حاصل کرنا ہے۔ وہ قومیں جو نوامیسِ قدرت کو اپنے قابو میں کر لیتی ہیں، وہی دنیا میں "تمکین فی الارض" (زمین میں اقتدار) کی حقدار ٹھہرتی ہیں۔ اس فکری موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خان رقم طراز ہیں:

> "بصیرت بتاتی ہے کہ جس طرح فطرت کے قوانین کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں جاری اور ساری ہیں اسی طرح انسانی اعمال کے بھی الٰہی قوانین ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں طور پر اپنے نتائج و اثرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جب ان قوانین کے مطابق عمل کیا جاتا ہے تو زندگی کو عروج اور سرفرازی نصیب ہوتی ہے، اور جب کبھی ان کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو قومیں ذلت اور رسوائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔"(7)

اقوام کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے یوسف حسین خان نے "اجتماعی خودی" کے فقدان کو سب سے بڑی وجہ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق جب کسی گروہ میں اپنی جداگانہ تہذیبی شناخت اور آئینِ ملت کا احساس باقی نہیں رہتا، تو وہ دوسری طاقتور قوموں میں ضم ہو جاتی ہے یا ان کی غلامی قبول کر لیتی ہے۔ بے عملی، عیش و عشرت اور حدودِ فطرت سے تجاوز وہ مہلک بیماریاں ہیں جو قوموں کے قوائے عملیہ کو شل کر دیتی ہیں۔ مصنف نے خبردار کیا ہے کہ دوسروں کی اندھی تقلید اور احساسِ کمتری وہ زہر ہے جو کسی بھی تمدن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ قدرت کبھی بھی غیر مستحق جماعت کو غلبہ عطا نہیں کرتی۔ یوسف حسین خان نے کلامِ اقبال کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں نیابتِ الٰہی صرف ان قوموں کا مقدر ہے جو اپنے وقت کا حساب دینے کو تیار ہوں۔ جب کوئی قوم اپنے مادی اور ذہنی سرمائے کی حفاظت نہیں کر پاتی، تو قدرت اس کی جگہ کسی دوسری تازہ دم اور سرگرمِ عمل قوم کو کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ تبدیلی کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ایک ابدی قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت رونما ہوتی ہے۔

یوسف حسین خان نے مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب استقرائی منطق اور تجرباتی علوم سے دوری کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک مسلمانوں نے مشاہدۂ کائنات اور تسخیرِ فطرت کو اہمیت دی، وہ دنیا کی قیادت کرتے رہے، مگر جیسے ہی وہ مابعد الطبیعیاتی الجھنوں اور بے عملی کے سکون میں پناہ لینے لگے، ان کا انحطاط شروع ہو گیا۔ مصنف کا استدلال ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو دوبارہ اسی سائنسی اور حرکی طرزِ فکر کی طرف بلایا ہے جو ان کے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس تاریخی اور سیاسی صورتحال پر ڈاکٹر یوسف حسین خان یوں لکھتے ہیں:

> "دنیا میں نیابتِ الٰہی ان قوموں کو ملتی ہے جو اپنے فکر و عمل اور جذب و تسخیر کی اہلیت سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی غیر مستحق جماعت کو غلبہ اور استیلا حاصل ہو اور اس کو تمکنِ ارضی کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہو۔ یہ ذمہ داری صرف اس گروہ کو ملتی ہے جو اپنے عمل کا حساب دینے کو تیار ہو۔"(8)

کتاب کے اس حصے میں یوسف حسین خان نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ عروج و زوال کا یہ چکر ختم نہیں ہوا، بلکہ آج بھی اگر کوئی قوم "عملِ صالح" کی کسوٹی پر پورا اترے تو وہ اپنی گذشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی شاعری اور نثر دونوں کا مقصد مسلمانوں کے اندر اسی خود اعتمادی کو بیدار کرنا ہے جو انہیں کائنات کے پوشیدہ اسرار تک پہنچا دے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے تاریخی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہی مسلمان اپنی کھوئی ہوئی شناخت بحال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے "روحِ اقبال" میں علامہ اقبال کے سیاسی و معاشی افکار کو محض جذباتی نعروں کے طور پر نہیں، بلکہ ایک مربوط عمرانی نظام کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی سیاست کا بنیادی مآخذ قرآنِ کریم اور اسوۂ رسول ﷺ ہے، جہاں دین اور سیاست دو الگ خانوں میں منقسم نہیں ہیں۔ یوسف حسین خان نے یہ نکتہ علمی قوت کے ساتھ واضح کیا ہے کہ اقبال نے مغربی سیاسی تصورات، بالخصوص میکاولی کے نظریۂ ریاست کی سخت مخالفت اس لیے کی کیونکہ وہ سیاست کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے محروم کر کے ایک ابلیسی نظام میں بدل دیتا ہے۔ مصنف کے مطابق، اقبال کے نزدیک ریاست کا مقصد انسانی تنظیم میں روح کا مقام پانا اور مساوات، یکجہتی اور آزادی کی اقدار کو زمین پر نافذ کرنا ہے۔

جمہوریت کے باب میں یوسف حسین خان نے اقبال کے تنقیدی اور تعمیری دونوں پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ اقبال کی جمہوریت سے بیزاری دراصل اس کے مادی اور سرمایہ دارانہ ڈھانچے سے تھی، جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے"۔ تاہم، مصنف یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال اصولِ الیکشن اور مشورے کے قرآنی تصور کے زبردست حامی تھے۔ ان کے نزدیک اسلامی جمہوریت مغرب کی ایجاد نہیں بلکہ اسلام کا اپنا نصب العین ہے، جہاں حاکمیتِ الٰہی کے تحت عوامی رائے کو انسانی ضمیر کی آزادی کا وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اس سیاسی بصیرت اور جمہوریت کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کے خیالات کی روشنی میں ایم ڈی موصوف احمد رقم طراز ہیں:

> "اقبال کی جمہوریت پرستی جن عناصر سے مرکب ہے ان پر غور کرنا ضروری ہے، وہ ابنِ آدم کو مخلوق ہی نہیں خالق بھی قرار دیتے ہیں۔ وہ انسانی تنظیموں کی بنیاد توحید کو قرار دیتے ہیں جس کی اصلیت مساوات، یکجہتی اور آزادی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان تصورات کی کسوٹی پر صرف جمہوریت پوری اترتی ہے۔ چنانچہ وہ جمہوری طرزِ حکومت کو مغرب کی ایجاد تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس نظام کو اسلام کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔"(9)

اقبال کے نظامِ معیشت کی تشکیلِ نو کے حوالے سے یوسف حسین خان نے یہ نکتہ ابھارا ہے کہ اقبال نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تضادات کا حل اسلامی اصولوں میں تلاش کیا ہے۔ مصنف کے تجزیے کے مطابق، اقبال کے نزدیک زمین اور اس کے تمام وسائل کا حقیقی مالک اللہ ہے اور جاگیرداری یا استحصالِ زر کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یوسف حسین خان نے دکھایا ہے کہ اقبال نے جہاں مارکس کے مادی تجزیے کی داد دی، وہاں اس کے الحاد کی مخالفت کی اور زکوٰۃ و صدقات کے نظام کو دولت کی منصفانہ گردش کا بہترین ذریعہ قرار دیا تاکہ معاشرے میں طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہو سکے۔

یوسف حسین خان نے کتاب کے اس حصے میں مسلمانوں کی سیاسی پستی کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ معیشت کا اسلامی نظام ناتمام ہی مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔ ان کے نزدیک جب تک مسلمان اپنی معاشی زندگی کو اخلاقی ضوابط کا پابند نہیں کریں گے، ان کی سیاسی آزادی بے معنی رہے گی۔ اقبال کے نزدیک معیشت محض پیٹ بھرنے کا نام نہیں بلکہ یہ خودی کے استحکام کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر فرد معاشی طور پر دوسروں کا دستِ نگر ہو گا تو اس کی خودی منتشر ہو جائے گی، اس لیے اسلام ہاتھ پھیلانے کے بجائے محنت اور قوتِ بازو پر زور دیتا ہے۔

اس موضوع پر پروفیسر آلِ احمد سرور کی رائے بھی نہایت وقیع ہے، جو یوسف حسین خان کی اس تشریح کو اقبال شناسی کا بہترین حصہ قرار دیتے ہیں۔ سرور کے نزدیک یوسف صاحب نے اقبال کے فلسفہ تمدن اور مملکتی اقدار کو جس طرح اسلامی مآخذ سے مربوط کیا ہے، وہ ان کی علمی گہرائی کا ثبوت ہے۔ ان کے بقول اقبال کی سیاست کسی بندھے ٹکے جامد نظام کی پابند نہیں بلکہ وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد کی قائل ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''مملکت کے متعلق اقبال کے خیالات صاف اور واضح تھے۔ جدید مملکت کی خصوصیات یوسف صاحب نے بہت اچھی طرح بیان کی ہیں اور مذہب اور سیاست کی ثنویت سے جو نقصانات ہوئے ہیں انہیں بھی تفصیل سے دکھایا ہے۔ اقبال تو مملکتی اقدار کا ماخذ ذاتِ باری کو سمجھتے ہیں۔ ان کی سیاست کسی بندھے ٹکے نظام کی پابند نہیں ہے۔''(10)

سیاسیات کی تشکیلِ نو میں یوسف حسین خان نے اقبال کے ''مردِ مومن'' یا ''انسانِ کامل'' کے کردار کو بھی معاشی اور سیاسی تناظر میں دیکھا ہے۔ ان کے مطابق اقبال کا انسانِ کامل محض ایک گوشہ نشین عابد نہیں بلکہ وہ ایک ایسا سیاسی رہنما ہے جو صداقت، عدالت اور شجاعت کا پیکر ہے۔ یہی وہ قیادت ہے جو امتِ مسلمہ کو دورِ جدید کے تلاطم سے نکال کر دوبارہ عالمی سیادت کے منصب پر فائز کر سکتی ہے۔ مصنف کا استدلال ہے کہ اقبال نے خلافتِ فاروقی کو ایک آئیڈیل نظامِ سیاست کے طور پر پیش کیا ہے جہاں عدلِ اجتماعی کی حکمرانی تھی۔

تحقیقی اعتبار سے یوسف حسین خان کا یہ مطالعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ انہوں نے اقبال کے انگریزی خطبات اور اردو فارسی شاعری کے مابین ایک فکری پل تعمیر کیا ہے۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ اقبال کے سیاسی و معاشی نظریات کسی مقامی ضرورت کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ وہ ایک عالمگیر انسانی فلاح کے منصوبے کا حصہ تھے۔ معاشی مساوات اور سیاسی حریت کا جو درس اقبال نے دیا، یوسف حسین خان نے اسے مسلمانوں کی تہذیبی بقا کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی یہ تشکیلِ نو دراصل مسلمانوں کو جدیدیت اور روایت کے ایک متوازن سنگم پر لا کھڑا کرتی ہے۔

علامہ اقبال کے فکری نظام میں مابعد الطبیعیات محض ایک تجریدی فلسفہ نہیں بلکہ یہ مذہبی وجدان اور کائناتی حقائق کی وہ تعبیر ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خالق اور اپنی ذات کے پُراسرار تعلق کو سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ''روحِ اقبال'' کے آخری باب میں ان پیچیدہ مباحث کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے، جنہیں عموماً اقبال شناسی کے مشکل ترین گوشے قرار دیا جاتا ہے۔ مصنف کے نزدیک اقبال کی مابعد الطبیعیات کا مرکز و محور یہ حقیقت ہے کہ کائنات ایک زندہ اور متحرک عضویہ ہے جو مستقل حرکت اور تغیر سے عبارت ہے۔ یوسف حسین خان نے دکھایا ہے کہ اقبال نے کس طرح مابعد الطبیعیاتی مسائل کو محض فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے ایمانی بصیرت اور جدید سائنسی دریافتوں کے سنگم پر حل کیا ہے۔

زمان اور وقت کا تصور اس باب کا ایک نہایت اہم نکتہ ہے، جسے یوسف حسین خان نے بڑی عرق ریزی سے واضح کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک وقت محض ماضی، حال اور مستقبل کا ایک تسلسل نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی فعلیت ہے۔ مصنف نے برگساں کے نظریے اور اسلامی تصورِ زماں کا تقابل کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کے ہاں وقت ایک ایسی حقیقت ہے جو ذاتِ باری کے تخلیقی ارادے سے پھوٹتی ہے۔ یوسف حسین خان کے بقول، جب ہم زمانے کو ایک نمو پذیر کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو اس کا نام ''تقدیر'' ہو جاتا ہے، جو کسی خارجی جبر کا نام نہیں بلکہ اشیاء کے اندر پوشیدہ امکانات کے ظہور کا عمل ہے۔

اس بصیرت انگیز نکتے کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

> ”زمانے کو جب ایک خلقی اور نمو پذیر کل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو قرآن کی زبان میں اس کو تقدیر کہتے ہیں۔ لفظ ’تقدیر‘ کی مسلمانوں کے یہاں اور غیر مسلموں میں بھی بالکل غلط تعبیر پیش کی گئی ہے۔ تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے جبکہ اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ تقدیر وہ زمانہ ہے جو سلسلۂ اسباب کے پھندے سے آزاد ہو چکا ہو۔“(11)

تقدیر کے حوالے سے یوسف حسین خان نے اقبال کے اجتہادی فکر کو نمایاں کیا ہے کہ انسان اپنی تقدیر کا خود خالق ہے، بشرطیکہ وہ اپنی خودی کو مستحکم کر لے۔ ان کے نزدیک تقدیر کوئی لکھا ہوا نوشتہ نہیں جسے بدلا نہ جاسکے، بلکہ یہ کائنات کی وہ وسعت ہے جس میں انسان اپنے عمل سے نئے رنگ بھر سکتا ہے۔ مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال نے جبر و اختیار کی قدیم بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ جس کی خودی بیدار ہے وہ زمان و مکان کا اسیر نہیں بلکہ ان کا راکب ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مذہبی وجدان انسان کو فطرت کے مادی بندھنوں سے آزاد کر کے الوہی فتوحات کے قابل بنا دیتا ہے۔

معراجِ نبوی ﷺ کے واقعے کی تشریح میں یوسف حسین خان نے اقبال کے روحانی اور سائنسی نقطۂ نظر کو بڑی مہارت سے سمویا ہے۔ ان کے نزدیک معراج محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ یہ عالمِ بشریت کی زد میں افلاک کے آنے کا ایک اعلان ہے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ اقبال کس طرح معراج کو ”انقلابِ شعور“ سے تعبیر کرتے ہیں، جہاں زمان و مکان کی قیود ختم ہو جاتی ہیں اور انسانی روح اپنی اصل یعنی ذاتِ باری سے ہم کلام ہوتی ہے۔ یوسف حسین خان کے مطابق معراج کا سبق یہ ہے کہ اگر انسان کا جذب و شوق سچا ہو تو وہ آنِ واحد میں کائنات کی تمام پہنائیوں کو مسخر کر سکتا ہے۔

اس مابعد الطبیعیاتی سفر میں یوسف حسین خان نے یہ نکتہ بھی اجاگر کیا ہے کہ حضور ﷺ کا مشاہدۂ حق دراصل انسانی خودی کی تکمیل کی آخری منزل ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ جس طرح ذرہ آفتاب کے سامنے اپنی ہستی کا امتحان لیتا ہے، اسی طرح معراج کی شب انسانِ کامل نے ذاتِ واجب کے سامنے اپنی خودی کو کامل عیار بنایا۔ مصنف کے نزدیک اقبال اس واقعے کے ذریعے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ مادی قوانین کے اسیر ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ وجدان کی اس قوت کو بیدار کریں جو انہیں زمان و مکان کے طلسم سے باہر نکال دے۔ اس روحانی تجربے اور مشاہدے کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان رقم طراز ہیں:

> ”غرض کے وجوب و امکان اور کون و مکان کے تمام عقدے طرفۃ العین میں حل ہو گئے اور آپ نے کائنات کے معانی و حقائق کا مختلف اشکال و صور میں اس طور پر مشاہدہ فرمایا کہ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر مشاہدہ کرنا ممکن نہیں۔ اقبال نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ معراج کا مسئلہ دراصل زمان و مکان کی آگاہی کا حل اور فطرت کے مقابلے میں انسانی نفس کی آزادی کا موثر ادعا ہے۔“(12)

مذہبی وجدان کے باب میں یوسف حسین خان نے عقل اور عشق کے تضاد کو بھی مابعد الطبیعیاتی تناظر میں دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک عقل مادی دنیا کے حساب کتاب کا نام ہے جبکہ وجدان یا عشق وہ نور ہے جو حقیقتِ مطلقہ کا براہِ راست ادراک کرتا ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اقبال کے ہاں مذہب محض چند عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک باطنی تجربہ ہے جو انسان کو کائنات کے نامیاتی نظام میں اس کا حقیقی مقام سمجھاتا ہے۔ یوسف حسین خان کا یہ استدلال نہایت قوی ہے کہ اقبال کی تمام فکر کی بنیاد یہی مذہبی تجربہ ہے جس نے انہیں جدید فلسفیوں سے ممتاز کیا ہے۔

یوسف حسین خان نے کتاب کے اس حصے میں موت اور بقائے دوام کے مسئلے کو بھی نہایت عالمانہ انداز میں چھیڑا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کے ہاں موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئے ارتقائی مرحلے کا آغاز ہے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ جو خودی عشق کے ذریعے مستحکم ہو جاتی ہے، موت اسے فنا نہیں کر سکتی کیونکہ وہ الٰہی صفات کا جزو بن جاتی ہے۔ یہ مابعد الطبیعیاتی یقین ہی ہے جو مومن کو موت کے خوف سے بے نیاز کر کے اسے حیاتِ جاودانی کی خوشخبری سناتا ہے۔ یوسف حسین خان کے مطابق، اقبال کا تصورِ موت دراصل خودی کے استحکام کی ایک حتمی آزمائش ہے۔

علامہ اقبال کی شعری جمالیات اور فنی اسلوب کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ان کے تخلیقی مزاج کو کسی ایک مخصوص دبستانِ فکر تک محدود رکھنے کے بجائے اسے روایت اور جدت کا ایک نادر سنگم قرار دیا ہے۔ ''روحِ اقبال'' میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کا شاعرانہ مسلک کلاسیکیت کی نظم و ترتیب اور رومانیت کی بے باکی و بلند پروازی کے مابین ایک ایسی نامیاتی وحدت ہے جو اردو ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ یوسف حسین خان کے نزدیک اقبال نے قدیم شعری روایات کے فنی محاسن کو برقرار رکھتے ہوئے ان میں جدید فکری ہیجان اور جذباتی تلاطم کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ان کا اسلوب محض لفظی نفاست کا نمونہ رہنے کے بجائے ایک حرکی توانائی بن گیا ہے۔

رومانیت کے باب میں یوسف حسین خان نے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ اقبال کی شاعری کا غالب رجحان قوت، آزادی اور داخلی تڑپ کی طرف ہے۔ وہ مغرب کی خالص عقلیت کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر ابھرتے ہیں، جہاں جذبہ اور وجدان عقل کے خشک پیمانوں کو توڑ کر حقیقتِ مطلقہ کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ مصنف کے مطابق اقبال کے ہاں رومانیت کی جڑیں اسلام کے تصورِ حریت اور ماضی کی عظمتِ رفتہ کی باز آفرینی میں پیوست ہیں۔ ان کا تخیل ماضی کے نقوش کو محض یادگار کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ انہیں حال کی تعمیر کے لیے ایک مہمیز کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

یوسف حسین خان نے کلامِ اقبال میں ''نفسِ گرم'' کی موجودگی کو ان کے رومانی مسلک کی سب سے بڑی نشانی قرار دیا ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق یہ نفسِ گرم فنکار کے ان جذباتی سوتوں سے پھوٹتا ہے جو اظہار کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ یہی وہ شدتِ جذبہ ہے جو اقبال کو محض ایک مصلح سے بلند کر کے ایک سچا اور مخلص فنکار بنا دیتی ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ اگرچہ مغربی رومانیت میں بعض اوقات اخلاقی حدود پامال ہو جاتی ہیں، مگر اقبال کی رومانیت اخلاقی نظم و ضبط اور خودی کے استحکام سے عبارت ہے، جو اسے نیٹشے جیسے مفکرین کے انتہا پسندانہ نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔ اقبال کے اس ہمہ گیر فنی مزاج پر ڈاکٹر یوسف حسین خان رقم طراز ہیں:

> ''اقبال کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس پر مشکل ہی سے آپ کوئی ادبی لیبل لگا سکتے ہیں۔ اس کے آرٹ میں مختلف دھارے آ کر مل گئے ہیں جنہیں اس نے اپنی ذہنی قوت سے ایک کر لیا ہے۔ بجائے مسلکوں کے تضاد کے اس کے ہاں ہمیں ایک قسم کی لطیف ہم آہنگی اور وحدت نظر آتی ہے جس کو وہ اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کرتا ہے۔''(13)

کلاسیکیت کے حوالے سے یوسف حسین خان کا استدلال یہ ہے کہ اقبال نے کبھی بھی فنی ضبط اور زبان و بیان کے مسلمہ قواعد سے انحراف نہیں کیا۔ وہ عروض کی پابندی اور تراکیب کی چستی کو شاعری کی بقا کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ اقبال کے ہاں جذبے کی جو فراوانی ملتی ہے، وہ کسی بے ہنگم سیلاب کی طرح نہیں بلکہ کلاسیکی روایات کے مضبوط بندھنوں میں مقید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بلند پروازی کے باوجود ایک خاص قسم کا توازن اور وقار پایا جاتا ہے جو صرف ان شعراء کے ہاں ممکن ہے جو اپنی روایت کے گہرے ادراک کے ساتھ جدت کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

یوسف حسین خان نے اقبال کے اسلوبِ شعری کو واضح کرنے کے لیے "قلندر" کی اصطلاح کا نہایت بلیغ استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک لفظ قلندر میں رومانیت کی آزادی، مستی اور جذب کے ساتھ ساتھ کلاسیکیت کی خودداری اور ثبات بھی موجود ہے۔ اقبال جب خود کو قلندر کہتے ہیں تو وہ دراصل اپنے اس فنی مسلک کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں جو ظاہری رسوم و قیود سے آزاد ہونے کے باوجود باطنی طور پر ایک کڑے نظم و ضبط کا پابند ہے۔ مصنف نے ثابت کیا کہ اقبال کی قلندری ان کی شاعری کا وہ جوہر ہے جو اسے قبولِ عام عطا کرتا ہے اور اسے زمان و مکان کی قید سے نکال کر آفاقیت بخش دیتا ہے۔

تخلیقی عمل اور جذباتی سوتوں کے باہمی ربط پر بحث کرتے ہوئے یوسف حسین خان نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اقبال کا آرٹ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے تخیل کو ایک جاندار خارجی شکل عطا نہ کر لے۔ ان کے نزدیک ایک کامیاب آرٹسٹ وہی ہے جو اپنی شعوری کیفیتوں کو ایک ایسی وحدت عطا کر دے جس میں اس کا سوزِ دروں جھلکتا ہو۔ مصنف نے گوئٹے اور اقبال کا تقابل کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ان دونوں عظیم فنکاروں نے حقیقت پسندی اور عینیت کے مابین ایک فنی توازن قائم کیا۔ اس فنی بلوغت اور نفسِ گرم کے حوالے سے ڈاکٹر یوسف حسین خان مزید لکھتے ہیں:

> "اقبال بھی اپنے آرٹ کی یہی نشانی بتاتا ہے کہ اس میں نفسِ گرم کی آمیزش ہے جو دوسروں کے ہاں نہیں۔ یہ نفسِ گرم جذباتی سوتوں کی ابلتی ہوئی تخلیقی قوت کا نتیجہ ہے جو اظہار کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔۔۔ اس کے آرٹ میں دوسرے بعض رومانیت پسندوں کے خلاف ضبط اور آزادی کے درمیان توازن موجود ہے جس سے مفہوم کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔"(14)

تحقیقی اسلوب میں یوسف حسین خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کا شاعرانہ مسلک دراصل انسانی خودی کی آزادی کا ایک جمالیاتی منشور ہے۔ انہوں نے کلاسیکیت سے ابلاغ کی قوت اور لفظوں کی حرمت لی، جبکہ رومانیت سے تڑپ، جستجو اور انقلاب کا ولولہ مستعار لیا۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو رنگ ابھرا، وہ اردو شاعری میں ایک نئی روایت کی بنیاد بنا۔ مصنف نے ثابت کیا کہ اقبال نے عقل اور عشق کے تضاد کو جس طرح اپنے فن میں حل کیا، وہی ان کے منفرد شاعرانہ مسلک کی اصل روح ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف "روحِ اقبال" نے اردو تنقید اور اقبال شناسی کے باب میں ایک ایسا عالمی معیار قائم کیا ہے جس نے علامہ اقبال کے افکار کو بین الاقوامی فلسفیانہ تناظر میں سمجھنے کی راہ ہموار کی۔ 1944ء میں اس کتاب کی اشاعت ایک ایسے وقت میں ہوئی جب اقبال کے کلام پر ہونے والی بیشتر بحثیں محض عقیدت مندی یا سطحی سیاسی تشریحات تک محدود تھیں۔ یوسف حسین خان نے اپنی علمی جلالت اور فلسفیانہ گہرائی کے ذریعے اقبال کو ارسطو، کانٹ، گوئٹے اور برگساں جیسے عظیم عالمی مفکرین کے مقابل لا کھڑا کیا، جس کے نتیجے میں اقبال شناسی محض ایک مقامی مطالعہ رہنے کے بجائے ایک عالمی علمی ڈسکورس میں تبدیل ہو گئی۔

اس کتاب کی تنقیدی اہمیت کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ اس نے اردو میں "وضاحتی اور تشریحی تنقید" کو ایک باقاعدہ فن کا درجہ عطا کیا۔ یوسف حسین خان نے اقبال کے ادق فلسفیانہ مسائل کو جس سہل اور منطقی اسلوب میں بیان کیا، اس نے آنے والے محققین کے لیے ایک ایسا ماڈل فراہم کیا جہاں تحقیق اور تنقید باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں زبان و ادب پر اس کتاب کے مستقل اثرات اس بات سے عیاں ہیں کہ آج بھی کلامِ اقبال کے موضوعاتی مطالعے کے لیے اسے ایک اساسی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ جدید تنقیدی روایت میں اس کتاب نے یہ شعور بیدار کیا کہ کسی عظیم شاعر کی تفہیم کے لیے اس کے تمدنی اور مذہبی پس منظر کا ادراک ناگزیر ہے۔

اقبال شناسی کے اس بلند معیار کا اعتراف اس عہد کے جید عالم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے بھی کیا، جو خود اقبالیات کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یوسف حسین خان کی یہ کاوش جامعیت اور بصیرت کے اعتبار سے اردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اس کتاب کو اقبال کی تعلیمات کی تفہیم کے لیے ایک ناگزیر دستاویز قرار دیتے ہوئے اس کی عالمانہ حیثیت کی توثیق کی ہے۔ اس علمی ثقاہت کے حوالے سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رائے درج ذیل ہے:

> ''میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ، نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی 'روحِ اقبال' اور مولانا عبدالسلام ندوی کی 'اقبالِ کامل'، ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور ان کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا دکھائی نہیں دیتا جو محتاجِ تشریح اور تشنۂ تنقید رہ گیا ہو۔''(15)

تعلیمی اور نصابی سطح پر اس کتاب کے اثرات نہایت گہرے اور ہمہ گیر ثابت ہوئے ہیں۔ دہائیوں سے برصغیر کی اہم جامعات میں اسے ایم اے اردو اور اقبالیات کے نصاب میں شامل رکھا گیا ہے، جس کی بڑی وجہ اس کا وہ ''تاثراتی اسلوب'' ہے جو خشک علمی مباحث کو بھی دلکش بنا دیتا ہے۔ یوسف حسین خان نے جملوں کے اختصار اور چستی کے ساتھ اقبال کی شعری جہتوں کا جو نقشہ کھینچا، اس نے طلبہ کی درسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تحقیقی ذوق بھی پیدا کیا۔ مصنف نے ثابت کیا کہ ایک بڑا نقاد وہی ہے جو شاعر کی روح تک رسائی حاصل کر کے اس کے باطنی تجربات کو قاری کے لیے عام فہم بنا دے۔

تاہم، جدید تنقیدی روایت میں اس کتاب پر بعض علمی اعتراضات بھی سامنے آئے جنھوں نے اقبال شناسی کے نئے رخ متعین کیے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری جیسے نقادوں نے یہ نکتہ اٹھایا کہ یوسف صاحب کا اندازِ نقد زیادہ تر موضوعاتی اور اکتسابی ہے، جو اقبال کے شعری وجود کی داخلی جمالیات سے زیادہ ان کے افکار کی صراحت پر مرتکز رہتا ہے۔ یہ اختلاف دراصل اردو تنقید کے ارتقاء کی علامت ہے، جس نے ''روحِ اقبال'' کی بنیاد پر ہی نئی تنقیدی عمارتیں کھڑی کیں۔ حامدی کاشمیری کے نزدیک اس کتاب کی شہرت کے باوجود اس کے تنقیدی طریقۂ عمل پر بحث کی گنجائش موجود ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر حامدی کاشمیری رقم طراز ہیں:

> ''کتاب کا تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کیجیے تو وہ توقعات پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتیں جو ایک ایسی تنقیدی تصنیف سے وابستہ کی جاسکتی ہیں جس نے اتنی تیزی سے شہرت کی منزلیں طے کی ہوں۔ کتاب کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس میں نقد و نظر کا کم و بیش وہی عمومی، وضاحتی اور اکتسابی طریقۂ عمل لایا گیا ہے جو عمومی طور پر اقبالیاتی تنقید کے موجودہ بیشتر حصے میں ملتا ہے۔''(16)

ان اختلافی آراء کے باوجود، یوسف حسین خان کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے کلام کو ایک ''نامیاتی وحدت'' کے طور پر پیش کیا جہاں فن، تمدن اور مذہب ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ جدید تنقیدی روایت پر اس کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ محققین نے اقبال کے سیاسی اور معاشی افکار کو بھی اسی سنجیدگی سے لینا شروع کیا جس طرح ان کے شعری محاسن کو لیا جاتا تھا۔ ''روحِ اقبال'' نے اردو ادب میں اس روایت کو مستحکم کیا کہ تنقید محض تعریف و توصیف کا نام نہیں بلکہ یہ مصنف کی باطنی شخصیت سے رابطہ قائم کرنے کا ایک علمی ذریعہ ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی ایسے ہم عصر محققین نے اس کتاب کو اقبالیات کے ''سات عجائبات'' میں شمار کر کے اس کی تاریخی اہمیت پر مہر تصدیق

ثبت کر دی ہے۔ ان کے نزدیک یوسف حسین خان نے اقبال کی نثر اور نظم کے مابین فکری تسلسل کو جس طرح واضح کیا ہے، اس کی مثال اردو میں آج تک نہیں ملتی۔ اس کتاب نے اقبال شناسی کے لیے جو بلند علمی معیار مقرر کیا، اس نے بعد میں آنے والے نقادوں، جیسے آلِ احمد سرور اور احتشام حسین کے لیے بھی ایک مضبوط فکری بنیاد فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر جب بھی کلامِ اقبال کی تفہیم کی بات ہوتی ہے، یوسف صاحب کے تجزیوں کو استناد کا درجہ دیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1. ڈاکٹر یوسف حسین خاں، روحِ اقبال، غالب اکیڈمی نئی دہلی، صدی ایڈیشن 1976ء، ص12
2. پروفیسر حامدی کاشمیری، یوسف حسین خاں کی اقبال شناسی، مشمولہ: ماہنامہ شیرازہ، سرینگر، جلد35، 1996ء، ص36
3. محسن عثمانی ندوی، یوسف حسین خان کی کتاب روحِ اقبال: ایک مطالعہ، مشمولہ: اقبال ریویو، حیدرآباد، نومبر 2008ء، ص8
4. ایم ڈی موصوف احمد، یوسف حسین خان کی ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2003ء، ص70
5. محسن عثمانی ندوی، یوسف حسین خان کی کتاب روحِ اقبال: ایک مطالعہ، ص17
6. ڈاکٹر یوسف حسین خاں، روحِ اقبال، ص145
7. ایضاً، ص21
8. ایضاً، ص78
9. ایم ڈی موصوف احمد، یوسف حسین خان کی ادبی خدمات، ص106
10. پروفیسر آلِ احمد سرور، نئے اور پرانے چراغ، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، 1972ء، ص24
11. ڈاکٹر یوسف حسین خاں، روحِ اقبال، ص391
12. ایضاً، ص434
13. ایضاً، ص70
14. ایضاً، ص67
15. ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1988ء، ص تمہید
16. پروفیسر حامدی کاشمیری، یوسف حسین خاں کی اقبال شناسی، ص36

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Dr. Yousuf Hussain Khan, *Rooh-e-Iqbal*, Ghalib Academy, New Delhi, Sadi Edition, 1976, p. 12.
2. Professor Hamidi Kashmiri, *Yousuf Hussain Khan ki Iqbal Shanasi*, mashmoola: Mahnama Shiraza, Srinagar, Vol. 35, 1996, p. 36.
3. Mohsin Usmani Nadvi, *Yousuf Hussain Khan ki Kitab Rooh-e-Iqbal: Aik Mutala'a*, mashmoola: Iqbal Review, Hyderabad, November 2008, p. 8.
4. M. D. Mausoof Ahmad, *Yousuf Hussain Khan ki Adabi Khidmaat*, Maqala baraye PhD, Aligarh Muslim University, 2003, p. 70.
5. Mohsin Usmani Nadvi, *Yousuf Hussain Khan ki Kitab Rooh-e-Iqbal: Aik Mutala'a*, p. 17.

6. Dr. Yousuf Hussain Khan, *Rooh-e-Iqbal*, p. 145.
7. Aizan, p. 21.
8. Aizan, p. 78.
9. M. D. Mausoof Ahmad, *Yousuf Hussain Khan ki Adabi Khidmaat*, p. 106.
10. Professor Aal-e-Ahmad Saroor, *Naye aur Purane Chiraagh*, Idara Farogh-e-Urdu, Lucknow, 1972, p. 24.
11. Dr. Yousuf Hussain Khan, *Rooh-e-Iqbal*, p. 391.
12. Aizan, p. 434.
13. Aizan, p. 70.
14. Aizan, p. 67.
15. Dr. Khalifa Abdul Hakeem, *Fikr-e-Iqbal*, Educational Book House, Aligarh, 1988, p. Tamhid.
16. Professor Hamidi Kashmiri, *Yousuf Hussain Khan ki Iqbal Shanasi*, p. 36.